قرآن شناسی | مسلمانوں کے درمیان قرآن کی کیا اہمیت ہے؟

فیلسوف اسلام علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

ترجمہ: جناب ڈاکٹر چوہدری صاحب

الف۔قرآن مجید انسانی زندگی کے مجموعی پروگرام کی ضمانت دیتا ہے۔

چونکہ دین اسلام جو ہر دوسرے دین و مذہب سے بڑھ کر انسانی زندگی کی سعادت اور خوشحالی کی ضمانت دیتا ہے قرآن مجید کے ذریعے ہی مسلمانوں تک پہنچا ہے اسی طرح اسلام کے دینی اصول جو ایمانی، اعتقادی، اخلاقی اور عملی قوانین کی کڑیاں ہیں، ان سب کی بنیاد قرآن مجید میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :انَّ ھٰذاالقرآن یھدی لِلّتی ھی اقوم (بنی اسرائیل۔۹) ترجمہ: ''اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب قرآن مجید اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے۔'' اور پھر فرماتا ہے :و نزّلنا علیک الکتٰب تبیانا لکل شی (نحل ۸۹) ترجمہ: اور ہم نے تم پر کتاب (قرآن) نازل کی جو ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرتی ہے اور اس پر روشنی ڈالتی ہے۔

پس واضح ہے کہ قرآن مجید میں دینی عقائد کے اصول، اخلاقی فضائل اور عملی قوانین کا مجموعہ بہت زیادہ آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ ان آیتوں کو یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا مفصل بیان: مندرجہ بالا چند تفصیلات میں غور کرنے کے بعد انسانی زندگی کے پروگراموں پر مبنی جو قرآن مجید میں لکھے ہوئے ہیں، ان کے حقیقی معنی کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

ا۔انسان اپنی زندگی میں کامیابی، خوشحالی اور سعادت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتا (خوشحالی اور سعادت، زندگی کی ایک ایسی صورت ہے کہ انسان ہمیشہ اس کی خواہش اور آرزو رکھتا ہے مثلاً آزادی، فلاح و بہبود اور ذریعۂ معاش میں زیادتی وغیرہ)

اور کبھی کبھی ایسے اشخاص بھی نظر آتے ہیں جو اپنی سعادت اور خوشحالی کو نظر انداز کر دیتے ہیں، مثلاً بعض اوقات ایک شخص خودکشی کر کے اپنی زندگی کو ختم کر لیتا ہے یا زندگی کی دوسری لذتوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے، اگر ایسے اشخاص کی روحی حالت پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ یہ لوگ اپنے فکر اور نظریئے کے مطابق خاص وجوہات میں زندگی کی سعادت کو پرکھتے اور جانچتے ہیں اور انہی وجوہات اور عناصر میں سعادت سمجھتے ہیں۔ مثلاً جو شخص خودکشی کرتا ہے وہ زندگی کی سختیوں اور مصیبتوں کی وجہ سے اپنے آپ کو موت کے منہ میں تصور کرتا ہے اور جو کوئی زہد و ریاضت میں مشغول ہو کر زندگی کی لذتوں کو اپنے لئے حرام کر لیتا ہے وہ اپنے نظریئے

اور طریقے میں ہی زندگی کی سعادت کو محسوس کرتا ہے۔

پس ہر انسان اپنی زندگی میں سعادت اور کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرتا ہے خواہ وہ اپنی حقیقی سعادت کی تشخیص میں ٹھیک ہو یا غلط۔

۲۔انسانی زندگی کی جد و جہد ہرگز پروگرام کے بغیر عمل میں نہیں آتی، یہ بالکل واضح اور صاف مسئلہ ہے اور اگر کسی وقت یہ مسئلہ انسان کی نظروں سے چھپا رہتا ہے تو وہ بار بار کے تکرار کی وجہ سے ہے، کیونکہ ایک طرف تو انسان اپنی خواہش اور اپنے ارادے کے مطابق کام کرتا ہے اور جب تک موجودہ وجوہات کے مطابق کسی کام کو ضروری نہیں سمجھتا اس کو انجام نہیں دیتا یعنی انسان کسی کام کو اپنے عقل و شعور کے حکم سے ہی کرتا ہے اور جب تک اس کی عقل اور اس کا ضمیر اس کام کی اجازت نہیں دیتے اس کام کو شروع نہیں کرتا، لیکن دوسری طرف جن کاموں کو اپنے لئے انجام دیتا ہے ان سے مقصد اپنی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس کے کردار و افعال میں براہ راست ایک تعلق ہوتا ہے۔

کھانا، پینا، سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، جانا، آنا وغیرہ سب کام ایک خاص اندازے اور موقع محل کے مطابق انجام پاتے ہیں۔کہیں یہ کام ضروری ہوتے ہیں اور کہیں غیر ضروری ۔ایک وقت میں مفید اور دوسرے وقت میں ضرر رساں یا غیر مفید۔لہٰذا ہر کام اس عقل و فکر اور انسانی شعور کے ذریعے انجام پاتے ہیں جو آدمی میں موجود ہے۔اسی طرح ہر چھوٹا اور بڑا کام اسی کلی پروگرام کے مطابق کرتا ہے۔

ہر انسان اپنے انفرادی کاموں میں ایک ملک کی مانند ہے جس کے باشندے مخصوص قوانین، رسم و رواج میں زندگی گزارتے ہیں اور اس ملک کی مختار اور حاکم طاقتوں کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اپنے کردار کو اس ملک کے باشندوں کے مطابق بنائیں اور پھر ان کو نافذ کریں۔

ایک معاشرے کی اجتماعی سرگرمیاں بھی انفرادی سرگرمیوں کی طرح ہوتی ہیں لہٰذا ہمیشہ ایک طرح کے قوانین و آداب و رسوم و اصول جو اکثریت کے لئے قابل قبول ہوں اس معاشرے میں حاکم ہونے چاہئیں۔ ورنہ معاشرے کے اجزاء افراتفری اور ہرج و مرج کے ذریعے بہت تھوڑی مدت میں درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔

بہر حال اگر معاشرہ مذہبی ہو تو حکومت بھی احکام مذہب کے مطابق ہوگی اور اگر معاشرہ غیر مذہبی اور متمدن ہو گا تو اس معاشرے کی تمام سرگرمیاں قانون کے تحت ہوں گی۔اگر معاشرہ غیر مذہبی اور غیر مہذب ہوگا تو اس کے لئے مطلق العنان اور آمرانہ حکومت نے جو قانون بنا کر اس پر ٹھونسا ہوگا یا معاشرے میں پیدا ہونے والے رسم و رواج اور قسم قسم کے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔

پس ہر حال میں انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں میں ایک خاص مقصد رکھنے کے لئے ناگزیر ہے، لہٰذا اپنے مقصد کو پانے کے لئے مناسب طریقۂ کار اختیار کرنے اور پروگرام کے مطابق کام کرنے سے ہرگز بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید بھی اس نظریئے کی تائید و تصدیق فرماتا ہے : **ولکل وجهة هو مولیها فاستبقوا**

الخیرات۔ (بقرہ ۱۴۸)

ترجمہ: تم میں سے ہر شخص کے لئے ایک خاص مقصد ہے جس کے پیش نظر کام کرتے ہو، پس ہمیشہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کوشش کرو تا کہ اپنے اعلیٰ مقصد کو حاصل کر سکو۔

بنیادی طور پر قرآن مجید میں 'دین' کا مطلب طریقہ زندگی ہے اور مومن و کافر اور حتی کہ وہ لوگ جو خالق (خداوند تعالیٰ) کے مکمل طور پر منکر ہیں، وہ بھی 'دین' کے بغیر نہیں ہیں کیونکہ انسانی زندگی ایک خاص طریقے کے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتی خواہ وہ طریقہ نبوت اور وحی کی طرف سے ہو یا بناوٹی اور مصنوعی قانون کے مطابق، اللہ تعالیٰ ان ستمگاروں کے بارے میں جو خدائی دین سے دشمنی رکھتے ہیں اور کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں فرماتا ہے: الذین یصدّون عن سبیل اللّٰہ و یبغونھا عوجا۔ (اعراف ۴۵)

ترجمہ: جو خدا کی راہ سے لوگوں کو ہٹاتے اور روکتے ہیں اور اس میں جو فطری زندگی کی راہ ہے (خواہ مخواہ) اس کو توڑ موڑ کر اپنے لئے اپناتے ہیں۔

۳۔ زندگی کا بہترین اور ہمیشگی طریقہ وہ ہے جس کی طرف انسانی فطرت رہنمائی کرے، نہ وہ کہ جو ایک فرد یا معاشرے کے احساسات سے پیدا ہوا ہو۔ اگر فطرت کے ہر ایک جزء کا گہرا اور بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر جزء زندگی کا ایک مقصد اور غرض و غایت لئے ہوئے ہے جو اپنی پیدائش سے لے کر اس خاص مقصد کی طرف متوجہ ہے اور اپنے مقصد کو پانے کے لئے نزدیک ترین اور مناسب ترین راہ کی تلاش میں ہے، یہ جزء اپنے اندرونی اور بیرونی ڈھانچے میں ایک خاص ساز و سامان سے آراستہ ہے جو اس کے حقیقی مقصود اور گوناگوں سرگرمیوں کا سرچشمہ شمار ہوتا ہے۔ ہر جاندار اور بے جان چیز میں فطرت کا یہی رویہ اور طریقہ کارفرما ہے۔

مثلاً گندم کا پودا اپنی پیدائش کے پہلے دن ہی، جب وہ مٹی سے اپنی سرسبز اور ہری بھری پتی کے ساتھ دانے سے باہر نکلتا ہے تو وہ (شروع سے ہی) اپنی فطرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، یعنی یہ کہ وہ ایک ایسا پودا ہے جس کے کئی خوشے ہیں اور اپنی فطری طاقت کے ساتھ عنصری اجزاء کو زمین اور ہوا سے خاص نسبت سے حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود کا حصہ بناتے ہوئے دن بدن بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے اور ہر روز اپنی حالت کو بدلتا ہے، یہاں تک کہ ایک کامل پودا بن جاتا ہے جس کی متعدد شاخیں اور خوشے ہوتے ہیں، پھر اس حالت کو پہنچ کر اپنی رفتار اور ترقی کو روک دیتا ہے۔

ایک اخروٹ کے درخت کا بھی اگر بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اپنی پیدائش کے دن سے لے کر ایک خاص مقصد اور ہدف کی طرف متوجہ ہے یعنی یہ کہ وہ ایک اخروٹ کا درخت ہے جو تنومند اور بڑا ہے، لہٰذا اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنے خاص اور مناسب طریقے سے زندگی کی راہ کو طے کرتا ہے اور اسی طرح اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتا ہوا اپنے انتہائی مقصد کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ یہ درخت گندم کے پودے کا راستہ اختیار نہیں کرتا جیسا کہ گندم کا پودا بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں اخروٹ

کے درخت کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔

تمام کائنات اور مخلوقات جو اس ظاہری دنیا کو بناتی ہیں، اسی قانون کے تحت عمل کرتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ نوعِ انسان اس قانون اور قاعدے سے مستثنیٰ ہو (انسان اپنی زندگی میں جو مقصد اور غرض و غایت بھی رکھتا ہو اس کی سعادت اسی مقصد کو پانے کے لئے ہے اور وہ اپنے مناسب ساز و سامان کے ساتھ اپنے ہدف تک پہنچنے کی تگ و دو میں مصروف ہے) بلکہ انسانی زندگی کے ساز و سامان کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ بھی دوسری ساری کائنات کی طرح ایک خاص مقصد رکھتا ہے جو اس کی خوش بختی اور سعادت کا ضامن ہے اور اپنے پورے وسائل اور کوشش کے ساتھ اس راہِ سعادت تک پہنچنے کی جد و جہد کرتا ہے۔

لہٰذا جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ خاص انسانی فطرت اور آفرینشِ جہان کے بارے میں ہے کہ انسان بھی اسی کائنات کا اٹوٹ انگ ہے۔ یہی چیز انسان کو اس کی حقیقی سعادت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اسی طرح سب سے اہم، پائیدار اور مضبوط قوانین جن پر چلنا ہی انسانی سعادت کی ضمانت ہے، انسان کی راہنمائی کرتے ہیں۔

گزشتہ بحث کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قال ربنا الذی اعطیٰ کل شئی خلقه ثم هدیٰ۔

(سورۂ طٰہٰ ۵۰)

ترجمہ: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز اور ہر مخلوق کو ایک خاص صورت (فطرت) عطا فرمائی، پھر ہر چیز کو سعادت اور خاص مقصد کی طرف رہنمائی کی۔

پھر فرماتا ہے: **الذی خلق فسویٰ۔ والذی قدّر فهدیٰ۔** (اعلیٰ ۲۔ ۳)

ترجمہ: وہ خدا جس نے مخلوق کے اجزا کو جمع کر کے (دنیا کو) بنایا اور وہ خدا جس نے ہر چیز کا خاص انداز مقرر کیا، پھر اس کو ہدایت فرمائی۔

پھر فرماتا ہے: **و نفس و ما سوّٰها۔ فالهمها فجورها و تقوٰها۔ قد افلح من زکّٰها۔ وقد خاب من دسّٰها۔** (شمس ۷۔ ۱۰)

قسم اپنے نفس کی اور جس نے اس کو پیدا کیا اور پھر اس نے نفس کو بدکاری اور پرہیزگاری کا راستہ بتایا۔ جس شخص نے اپنے نفس کی اچھی طرح پرورش کی اس نے نجات حاصل کی اور جس شخص نے اپنے نفس کو آلودہ کیا وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے: **فاقم وجهک للدّین حنیفا فطرت اللّٰه التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق اللّٰه ذالک الدین القیم۔** (روم ۳۰)

ترجمہ: اپنے (رخ) آپ کو دین پر استوار کر، پوری توجہ اور تہہ دل سے دین کو قبول کر، لیکن اعتدال پسندی کو اپنا پیشہ بنا اور افراط و تفریط سے پرہیز کر، یہی خدا کی فطرت ہے اور خدا کی فطرت میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وہ دین ہے جو انسانی زندگی کا انتظام کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ (مضبوط اور بالکل سیدھا دین ہے)

پھر فرماتا ہے: **انّ الدین عند اللّٰه الاسلام۔**

(آل عمران ۱۹)

ترجمہ: دین اور زندگی کا طریقہ خدا کے سامنے

جھکنے میں ہی ہے ، اس کے ارادے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں ہے، یعنی اس کی قدرت اور فطرت کے سامنے، جو انسان کو ایک خاص قانون کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتا ہے :و من یبتغ غیر **الاسلام دینافلن یقبل منہ۔ (آل عمران ۸۵)**

ترجمہ: جو کوئی دین اسلام کے بغیر یعنی خدا کے ارادے کے بغیر کسی اور دین کی طرف رجوع کرے تو اس کا وہ دین یا طریقہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

مندرجہ بالا آیات اور ایسی ہی دوسری آیات جو اس مضمون کی مناسبت میں نازل ہوئی ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی ہر مخلوق اور منجملہ انسان کو ایک خاص سعادت اور فطری مقصد کی طرف یعنی اپنی فطرت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے حقیقی اور واقعی راستہ وہی ہے جس کی طرف اس (انسان) کی خاص فطرت دعوت کرتی ہے، لہٰذا انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قوانین پر کاربند ہے کیونکہ ایک حقیقی اور فطری انسان کی طبیعت اسی کی طرف رہنمائی کرتی ہے نہ کہ ایسے انسانوں کو جو ہوا و ہوس اور نفسِ امّارہ سے آلودہ ہوں اور احساسات کے سامنے دستہ بستہ اسیر ہوں۔

فطری دین کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانی وجود کا نظام درہم برہم نہ ہونے پائے اور ہر ایک (جزء) کا حق بخوبی ادا ہو۔لہٰذا انسانی وجود میں جو مختلف اور متضاد نظام مثلاً گونا گوں احساساتی قوتیں اللہ تعالیٰ نے بخشی ہیں وہ منظّم صورت میں موجود ہیں ، یہ سب قوتیں اس حد تک دوسروں کے لئے مزاحمت پیدا نہ کریں، ان کو عمل کا اختیار دیا گیا ہے

اور آخر کار انسان کے اندر عقل کی حکومت ہونی چاہئے نہ کہ خواہشاتِ نفسانی و احساسات وجذبات کا غلبہ اور معاشرے میں بھی انسانوں کے حق وصلاح پر مبنی حکومت قائم ہو نہ کہ ایک آمرانہ اور ایک طاقتور انسان کی خواہشات اور ہوا وہوس کے مطابق اور نہ ہی اکثریت افراد کی خواہشات کے مطابق اگر چہ وہ حکومت ایک جماعت یا گروہ کی صلاح اور حقیقی مصلحت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تشریعی (شرعاً و قانوناً) لحاظ سے حکومت صرف اللہ کی ہے اور اس کے بغیر حکومت کسی اور کا حق نہیں ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
ع حکمراں اک وہی باقی بتان آذری (اقبال) کہ فرائض، قوانین اور شرعی قوانین بنائے یا تعین کرے، کیونکہ جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ صرف وہی قوانین اور قواعد انسانی زندگی کے لئے مفید ہیں جو اس کے لئے فطری طریقے پر معیّن کئے گئے ہوں یعنی اندرونی اور بیرونی عناصر وعوامل اور علل انسان کو ان فرائض کی انجام دہی کی دعوت کریں اور اس کو مجبور کریں مثلاً ان کے انجام دینے میں خدا کا حکم شامل ہو، کیونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اس کام کو چاہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو انجام دینے کی تمام شرائط اور وجوہات کو پہلے سے پیدا کیا ہوا ہے، لیکن کبھی کبھی یہ وجوہات اور شرائط ایسی ہیں کہ کسی چیز کی جبری

پیدائش کا موجب اور سبب بن جاتی ہیں، جیسے روزانہ قدرتی حوادث کا وجود میں آنا اور اس صورت میں اس خدائی ارادے کو ''تکوینی ارادہ'' کہتے ہیں اور کبھی یہ وجوہات اور شرائط اس قسم کی ہیں کہ انسان اپنے عمل کو اختیار اور آزادی کے ساتھ انجام دیتا ہے جیسے کھانا، پینا وغیرہ۔ اور اس صورت میں اس عمل کو ''تشریعی ارادہ'' کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں کئی جگہ فرماتا ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ (یوسف ۴۰، ۶۷)

ترجمہ: خدا کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے اور حکومت صرف اللہ ہی کے واسطے ہے۔

اس مقدمہ کے واضح ہوجانے کے بعد جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید ان تین مقدموں کے پیش نظر کہ انسان اپنی زندگی میں ایک خاص مقصد اور غرض و غایت رکھتا ہے (یعنی زندگی کی سعادت) جس کو اپنی پوری زندگی میں حاصل کرنے کے لئے جد و جہد اور کوشش کرتا ہے اور یہ کوشش بغیر کسی پروگرام کے نتیجہ بخش نہیں ہوگی، لہٰذا اس پروگرام کو بھی خدا کی کتابِ فطرت آفرینش میں ہی پڑھنا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو خدائی تعلیم کے ذریعے ہی سیکھا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید نے ان مقدمات کے پیش نظر انسانی زندگی کے پروگرام کی بنیاد اس طرح رکھی ہے:-

قرآن مجید نے اپنے پروگرام کی بنیاد ''خدا شناسی'' پر رکھی ہے اور اس طرح ''ماسو اللہ'' سے بیگانگی کو شناخت دین کی اولین بنیاد قرار دیا ہے۔ اس طرح خدا کو پہچوانے کے بعد ''معاد شناسی'' (روز قیامت پر اعتقاد جس دن انسان کے اچھے برے کاموں کا بدلہ اور عوضانہ دیا جائے گا) کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور اس کو ایک دوسرا اصول بنایا۔ اس کے بعد معاد شناسی سے پیغمبر شناسی کا نتیجہ حاصل کیا، کیونکہ اچھے اور برے کاموں کا بدلہ، وحی اور نبوت کے ذریعے اطاعت، گناہ نیک و بد کاموں کے بارے میں پہلے سے بیان شدہ اطلاع کے بغیر نہیں دیا جاسکتا۔

اس مسئلہ کو بھی ایک الگ اصول بیان فرمایا:

مندرجہ بالا تین اصولوں یعنی ماسواللہ کی نفی پر ایمان، نبوت پر اعتقاد اور معاد پر ایمان کو دینِ اسلام کے اصول کہا ہے۔

اس کے بعد دوسرے درجہ پر اخلاقِ پسندیدہ اور نیک صفات جو پہلے تین اصولوں کے مناسب ہوں اور ایک حقیقت پسند اور باایمان انسان کو ان صفات حمیدہ سے متصف اور آراستہ ہونا چاہئے، بیان فرمایا۔ پھر عملی قوانین جو دراصل حقیقی سعادت کے ضامن اور اخلاق پسندیدہ کو جنم دے کر پرورش دیتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر حق و حقیقت پر مبنی اعتقادات اور بنیادی اصولوں کو ترقی و نشو و نما دیتے ہیں، ان کی بنیاد ڈالی اور ان کے بارے میں وضاحت فرمائی۔

کیونکہ جو شخص جنسی مسائل یا چوری، خیانت خرد برد اور دھوکے بازی میں ہر چیز کو جائز سمجھتا ہے اس سے کسی قسم کی پاکیِ نفس جیسی صفات کی ہرگز توقع نہیں رکھی جاسکتی یا جو شخص مال و دولت جمع کرنے کا شائق اور شیفتہ ہے اور لوگوں کے مالی حقوق اور قرضوں کی ادائیگی کی طرف ہرگز توجہ نہیں کرتا وہ کبھی سخاوت کی صفت سے متصف نہیں ہوسکتا یا جو شخص خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا اور ہفتوں بلکہ مہینوں تک خدا کی یاد سے غافل رہتا ہے وہ کبھی خدا اور روز قیامت پر ایمان اور

ایسے ہی ایک عابد کی صفات رکھنے سے قاصر ہے۔

پس پسندیدہ اخلاق، مناسب اعمال وافعال کے سلسلے ہی سے زندہ رہتے ہیں ۔ چنانچہ پسندیدہ اخلاق، بنیادی اعتقادات کی نسبت یہی حالت رکھتے ہیں ۔ مثلاً جو شخص کبر وغرور، خودغرضی اور خود پسندی کے سوا کچھ نہیں جانتا تو اس سے خدا پر اعتقاد اور مقام ربوبیت کے سامنے خضوع وخشوع کی توقع نہیں رکھی جاسکتی ۔ جو شخص تمام عمر انصاف و مروت اور رحم وشفقت اور مہربانی کے معنی سے بے خبر ہے وہ ہرگز روزِ قیامت میں سوال وجواب پر ایمان نہیں رکھ سکتا۔

خداوند تعالیٰ حقانی اعتقادات اور پسندیدہ اخلاق کے سلسلے میں جوخود ایمان اور اعتقاد سے وابستہ ہیں ، اس طرح فرماتا ہے : اِلَیہِ یَصعَدُالکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالعَمَلُ الصَّالِحُ یَرفَعُهُ (فاطر ۱۰)

ترجمہ: خداتعالیٰ پر پختہ اور پاک ایمان ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے اور اچھے کاموں کو وہ خود بلند فرماتا ہے، یعنی اعتقادات کو زیادہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اور خصوصاً عمل پر اعتقاد کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ثُم کان عاقِبۃُ الذین اَساۓ و السّوآیٰ آنْ کَذَّبوا بِایاتِ اللّٰہِ وَ کانُوا بِھایَستھزءون (روم ۱۰)

ترجمہ: اس کے بعد آخر کار جو لوگ برے کام کرتے تھے ان کا کام یہاں تک آپہنچا کہ خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کے ساتھ مسخرہ پن کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید حقیقی اسلام کی بنیادوں کو کلی طور پر مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے:-

۱۔ اسلامی اصول وعقائد جن میں دین کے تین اصول شامل ہیں : یعنی توحید، نبوت اور معاد (قیامت) اور اس قسم کے دوسرے فرعی عقائد مثلاً لوح ،قلم ، قضا ،قدر ، ملائکہ،عرش، کرسی اور آسمان وزمین کی پیدائش وغیرہ۔

۲۔ پسندیدہ اخلاق

۳۔ شرعی احکام اور عملی قوانین جن کے متعلق قرآن مجید نے کلی طور پر بیان فرمایا ہے اور ان کی تفصیلات اور جزئیات کو پیغمبر اکرمؐ کے بیانات یا توضیحات پر چھوڑ دیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی ''حدیث ثقلین'' کے مطابق جس پر تمام اسلامی فرقے متفق ہیں اور مسلسل ان احادیث کو نقل کرتے رہے ہیں، اہلبیتؑ کو اپنا جانشین فرمایا ہے۔

ب۔ قرآن مجید نبوت کی سند ہے

قرآن مجید چند جگہ وضاحت سے بیان فرماتا ہے کہ یہ (قرآن) خدا کا کلام ہے یعنی یہ کتاب انہی موجودہ الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی انہی الفاظ میں اس کو بیان فرمایا ہے۔

اس معنی کو ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اور ایک انسان کا کلام نہیں ، بار بار بہت زیادہ آیاتِ شریفہ میں اس موضوع پر زور دیا گیا ہے اور قرآن مجید کو ہر لحاظ سے ایک معجزہ کہا گیا ہے جو انسانی طاقت اور توانائی سے بہت بالا وبرتر ہے۔

جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے : اَمْ یَقُولونَ تَقَوَّلَه بل لا یومِنون ۔فَلیاتُو بِحَدیثٍ مِثله اِن کانوا صٰدقین (طور ۳۳، ۳۴)

ترجمہ: یا کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے خود قرآن کو بنا (گھڑ) کر اسے خدا سے منسوب کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ پس اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں تو اس (قرآن) کی طرح عبارت کا نمونہ لائیں (بنائیں)۔

اور پھر فرمایا: قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الانس والجنُّ علیٰ اَن یَّاتُو بِمِثل ھٰذا القرآنِ لا یَاتُون بِمثلہ ولَو کان بَعضُھم لِبَعضٍ ظَھِیراً (بنی اسرائیل/ اسریٰ ۸۸)

ترجمہ: اے رسولؐ کہہ دو کہ اگر (سارے جہان) کے آدمی اور جن اس بات پر اکھٹے اور متفق ہوں کہ قرآن کا مثل لے آئیں تو (ناممکن) اس کے برابر نہیں لا سکتے اگر چہ (اس کوشش میں) وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔

اور پھر فرمایا: اَمْ یَقُولونَ افتَراہُ قُلْ فَاتُو بِعَشَرِ سُوَرٍ مِثْلِہٖ مُفتَرَیتٍ (ہود ۱۳)

ترجمہ: کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (تم) نے اس (قرآن) کو اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے تو تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) ایسی ہی دس سورتیں اپنی طرف سے گھڑ کے لے آؤ۔

اور پھر فرماتا ہے: اَمْ یَقُولُون افتَراہُ قُل فَاْتُوا بِسُوْرَۃٍ مِثْلِہٖ (سورۂ یونس ۳۸)

ترجمہ: آیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو رسول نے خود جھوٹ موٹ بنا کر خدا سے منسوب کر لیا ہے، پس اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ اس کی مانند صرف ایک ہی سورت لکھ کر لے آؤ۔

اور پھر (ان لوگوں کا) پیغمبر اکرمؐ سے مقابلہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَ اِنْ کُنتُم فی رَیْبٍ مِمَّا نَزَّلْنا علیٰ عبدِنا فَاْتُو ابِسُورۃٍ مِن مِثْلِہٖ (بقر ۲۳)

ترجمہ: اور جو چیز (قرآن) ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے اگر تمہیں اس میں کسی قسم کا شک وشبہ ہے تو ایسے انسان کی طرح جو لکھا پڑھا نہیں اور جاہلیت کے ماحول میں اس کی نشوونما ہوئی ہے، اس طرح کی ایک قرآنی سورت لکھ کر لاؤ۔

اور پھر اختلاف اور تضاد نہ رکھنے کے متعلق برابری اور مقابلہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: اَفَلا یَتدَبَّرُونَ القرآنَ ولَو کان مِنْ عِنْدِ غَیرِ اللہِ لَوَجَدُوْا فِیہِ اِختِلافاً کَثِیرا (نساء ۸۲)

ترجمہ: آیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر یہ قرآن خدا کے بغیر کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلافات ہوتے کیونکہ اس دنیا میں ہر چیز تغیر اور ترقی پذیری کے قانون میں شامل ہے اور وہ اختلاف اجزاء اور احوال سے مبرا نہیں ہوتی اور اگر قرآن انسان کا بنایا ہوا ہوتا تو جیسا کہ تیئس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا تو یہ (قرآن) اختلافات اور تضادات سے مبرا نہیں ہو سکتا تھا اور اس طرح ہرگز یکساں نہ ہوتا۔

قرآن مجید جو ان فیصلہ کن اور پختہ انداز سے خدا کا کلام ہونے کا اعلان اور اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اول سے لے کر آخر تک صاف طور پر حضرت محمدؐ کا اپنے رسول اور پیغمبر کے طور پر تعارف کراتا ہے اور اس طرح آنحضرتؐ کی نبوت کی سند لکھتا ہے۔ اسی بناء پر کئی بار خدا کے کلام میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی نبوت اور پیغمبری کے

بقیہ صفحہ ۲۰/ پر

تکلیف کا باعث نہ ہوسکتا تھا جتنا کہ آپ کے دعوے کو حکومت کی طرف سے غلط قرار دیا جانا۔ یہ وہ صدمہ تھا جس کا اثر سیدہ کے دل پر مرتے دم تک رہا۔

وصیتیں :- حضرت فاطمہ زہراؑ نے طبقۂ خواتین کے لئے پردہ کی یادگار اہمیت اس وقت بھی قائم کی جب آپ دنیا سے رخصت ہونے والی تھیں اس طرح کہ آپ ایک دن غیر معمولی طور پر فکر مند نظر آئیں آپ کی چچی (جعفر طیار کی بیوہ) اسما بنت عمیس نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جنازہ اٹھانے کا یہ دستور اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ عورت کی میت کو بھی تختہ پر اٹھایا جاتا ہے جس سے اس کا قدو قامت نظر آتا ہے۔ اسماء نے کہا میں نے ملک حبشہ میں ایک طریقہ جنازہ اٹھانے کا دیکھا ہے وہ غالباً آپ کو پسند ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے تابوت کی ایک شکل بنا کر دکھائی اس پر سیدۂ عالمؑ بہت خوش ہوئیں اور پیغمبرؐ کے بعد صرف یہ ایک موقع ایسا تھا کہ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی چنانچہ آپ نے وصیت فرمائی کہ آپ کو اسی طرح کے تابوت میں اٹھایا جائے مؤرخین تصریح کرتے ہیں کہ سب سے پہلی لاش جو تابوت میں اٹھی ہے وہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی تھی اس کے علاوہ آپ نے یہ وصیت بھی فرمائی تھی کہ آپ کا جنازہ پردۂ شب میں اٹھایا جائے اور ان لوگوں کو اطلاع نہ دی جائے جنکے طرز عمل نے آپ کے دل میں زخم ڈال دیے تھے اور جن سے انتہائی ناراضگی کے عالم میں آپ دنیا سے رخصت ہوئیں

وفات :- آخر سیدۂ عالمؑ نے اپنے والد بزرگوار رسولؐ خدا کی وفات کے ۳مہینہ بعد تیسری جمادی الثانیہ ۱۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ رات کو اٹھایا گیا۔ حضرت علیؑ ابن ابیطالب نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ صرف بنی ہاشم اور سلمان اور مقداد و عمار ایسے چند مخلصین کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی اور خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا آپ کے محل دفن کی اطلاع بھی عام طور سے لوگوں کو نہیں ہوئی جس کی بنا پر یہ اختلاف رہ گیا کہ آپ جنت البقیع میں دفن ہیں یا اپنے ہی مکان میں جو بعد کو مسجد رسول کا جزو بن گیا۔ جنت البقیع میں جو آپ کا روضہ تھا وہ بھی باقی نہیں رہا بلکہ ۸رشوال ۱۳۴۴ھ کو ابن مسعود نے دوسرے مقابر اہل بیتؑ کے ساتھ اسے بھی منہدم کردیا۔

بقیہ: مسلمانوں کے درمیان۔۔۔۔

ثبوت میں خدا کی شہادت یعنی قرآن مجید کی رو سے اپنی نبوت کا اعلان کرے: قُلْ كَفىٰ بِاللهِ شَهِيداً بَيْنِي وَبَيْنَكُم (رعد ۴۳) ترجمہ: اے نبیؐ کہدے کہ میرے اور تمہارے درمیان میری نبوت اور پیغمبری کے متعلق خود خدا کی شہادت کافی ہے۔

ایک اور جگہ (قرآن مجید) میں خداوند کریم کی شہادت کے علاوہ فرشتوں کی شہادت بھی ہے: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشهَدُ بِمَا اَنزَلَ اِلَيكَ اَنزَلَهُ بِعِلمِهِ والمَلائِكَةُ يَشْهَدُونَ وكَفىٰ بِاللهِ شَهِيداً (نساء ۱۶۶)

ترجمہ: لیکن خداوند تعالیٰ نے جو چیز تجھ پر نازل کی ہے اس کے متعلق خود بھی شہادت دیتا ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں اور صرف خداوند تعالیٰ کی شہادت کافی ہے۔

❁❁❁